آئینہ سچ بولتا ہے

ہاشم علی خان ہمدم

تیسرا مجموعۂ کلام

ہاشم علی خان ہمدمؔ

مکتبۂ ارمغانِ ابتسام

https://archive.org/details/@nzkiani

nzkiani@gmail.com

تعارف

نام : ہاشم علی خان ہمدؔم

تاریخ پیدائش : ۷/جولائی ۱۹۷۳ء

تعلیم : ایم اے اردو، ایم اے انگریزی، بی ایڈ (پنجاب یونی ورسٹی لاہور)

جائے پیدائش : خودہ شریف تحصیل حسن ابدال ضلع اٹک

پیشہ : درس وتدریس

سرکاری ملازمت : اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ

ادبی خدمات : بانی ومنتظم موج غزل ادبی فورم (فیس بک)

اصناف سخن : حمد، نعت، غزل، نظم، سلام، منقبت، طنز ومزاح

تصانیف : ۱۔ موجِ کرم (حمد ونعت)

۲۔ پانچواں موسم (غزلیات)

۳۔ آئینہ سچ بولتا ہے (غزلیات)

۴۔ موج غزل (طرحی غزلیات)

۵۔ محبت کی زباں (طرحی غزلیات)

۶۔ دھوپ کی دیوار (طرحی غزلیات)

۷۔ چراغِ فکر (طرحی غزلیات)

۸۔ جہانِ خواب (طرحی غزلیات)

۹۔ چشم تماشا (طرحی غزلیات)

۱۰۔ سراب سے آگے (طرحی غزلیات)

۱۱۔ تیسرے کنارے پر (طرحی غزلیات)

۱۲۔ نمودِ سحر (طرحی غزلیات)

۱۳۔ آدھا سفر (طرحی غزلیات)

۱۴۔ دم (منتخب دیوان)

۱۵۔ آخری چراغ (غزلیات)

۱۶۔ طرحی غزلیات (زیرِ طبع)

۱۷۔ نظموں کا مجموعہ (زیرِ طبع)

۱۸۔ نعتیہ نظموں کا مجموعہ (زیرِ طبع)

۱۹۔ نعتیہ مجموعہ (زیرِ طبع)

۲۰۔ مزاحیہ کلام (زیرِ طبع)

پتہ : خودہ شریف، تحصیل حسن ابدال ضلع اٹک۔

فون نمبر : 0311-5509555

انتساب

نذرانۂ دل و جاں

اپنے والدین، بیوی، بچوں

اساتذہ اور دوستوں

کے نام

روشنی کے پھول کھلتے دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں

حرف میں رس گھولتا ہے، آئینہ سچ بولتا ہے

مشتری ہوشیار باش

کتاب کا نام آئینہ سچ بولتا ہے۔

شاعر ہاشم علی خان ہمدمؔ۔

وضاحت یہ ہاشم علی خان ہمدمؔ کے غزلوں پر مبنی کلام کا دوسرا اور مجموعی طور پر اب تک کا تیسرا مجموعہ ہے جسے برقی کتاب کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

صفحات ۱۷۳

سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء

ہدیہ دُعائیں۔

پبلشر مکتبۂ ارمغانِ ابتسام، اسلام آباد۔

برقی ڈاک itshamdam@gmail.com

فہرست

حمد سے آغازِ حرفِ آ گہی پروردگار!

روشنی ، بس روشنی ، بس روشنی ، پروردگار!

حرفِ آ گہی کی طلب وہ روشنی ہے جو ہر سخن دان کا وجدان ہے جس کے رنگوں سے حقیقت منعکس ہوتی ہے۔ یہ حقیقت فکر کے کاغذ پر نمودار ہوتی ہے تو شعر وجود پاتا ہے۔ شعر کی نمود دل و دماغ کو معطر اور منوّر رکھتی ہے۔ پروردگارِ حسنِ بیاں حقیقت سے آشنا کرتا ہے تو بولنے کا ہنر عطا ہوتا ہے۔ جسم کے خلیے خلیے اور روح کے دم دم سے ذاتِ بابرکات کا شکر گزار ہوں کہ جس نے حرفِ آ گہی کی طلب سے لبریز رکھا اور حسنِ بیاں کی روشنی وجدان کی۔ قبولِ حرف کی گھڑیوں میں جب خود سے ہم کلام ہوتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ آئینہ سچ بولتا ہے، روشنی کے پھول دل وجاں کو منور کرتے ہیں۔ روشنی سے کشیدہ سچ مجھے وجدان کی فضاؤں میں ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کراتا ہے جس سے روح سرشار اور دل بے دار رہتا ہے۔ داخلی بے داری ہی خارجیت کے رنگوں کا ادراک رکھتی ہے۔ بے خودی، سرشاری اور خود بینی سے وہ چشمِ بصیرت وا ہوتی ہے جو کائنات کی وسعتوں میں چھپے راز حرف کے ادراک سے کھولنے کی لامحدود حدِّ نگاہ رکھتی ہے۔

مرے شعور کی آبیاری ادراک میں بہتے روشنی کے دھارے سے ہوتی ہے جو سفید بادلوں کے گالوں سے پھوٹتا ہے تو کبھی نیلگوں آسمان سے نیلی کرنوں کی صورت نمودار ہوتا ہے۔ یہ روشنی کا دھارا کئی رنگوں کے امتزاج سے وجود پاتا ہے۔ کبھی زرد، کبھی سبز، کبھی سرخ، کبھی قرمزی، کبھی لاجوردی، کبھی نارنجی اور کبھی بنفشی رنگ میرے احساس کے کینوس پر تصویر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کسی پرنور منشور سے کشیدہ شعر ہوتا حرف میری آرزو اور مراد ہے۔ لطیف احساس میں حرفِ آ گہی کی محبت سے بامراد

ہونے پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں۔

زندگی نشیب وفراز کا نام ہے جس میں ہر رنگ، ہر موسم، ہر منظر اپنی مثال آپ ہے۔ مجھے پانچواں موسم مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے جو محبت کے رنگوں سے سجا اندر کا موسم ہے جس کی ہر ادا منفرد ہے ۔انفراد کی خواہش میں وقت کا تیسرا کنارہ، تصویر کا تیسرا رخ، موسیقی کا آٹھواں سر، سرِ آئینہ خود کلامی ، پسِ آئینہ دوسرے آدمی سے ملاقات، آٹھویں آسمان کے در کھولتا روشنی کا آٹھواں رنگ میرا وجدان ہے۔ محبت اور آگہی رکھنے والی تیسری آنکھ روشن ہو تو آئینہ سچ بولتا ہے اور آگہی کے آخری چراغ تک روشنی کے پھول کھلتے رہتے ہیں۔ چراغِ حرف سے زندگی پڑھاتے ہوئے آئینہ پوش ہونا میری خوش لباسی اور غزل پوشی ہے۔ میں سرشار ہوں کہ مجھے یہی لباس زیبا ہے جس پر موئے قلم سے اپنی پسند کے نقش پینٹ کرتا ہوں۔

ادب زندگی کا نمائندہ ہونا چاہیے جس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ اس انداز میں کیا جائے کہ ادبی فن پارہ تکنیکی، فنی، لسانی، سماجی اور آفاقی اقدار کی تصویر پیش کرے۔ مثبت رویوں کا فروغ ادبی منصب ہے۔ مایوسی اور منفی سوچ سے مبرّا اچھے اور خوب صورت لہجے میں پاکیزہ، اعلیٰ اور ارفع خیالات کا اظہار یہ ہی خوب صورت ادبی رویہ ہے۔ آفاقی محبت، فطرت سے لگاؤ، خلوص اور انسان دوستی، امن اور اخوت کا پیغام دینا شاعر کو زیبا ہے۔

زیرِ نظر شعری مجموعہ پچھلے عشرے کی غزلیات پر مشتمل ہے مگر بوجوہ اشاعت نہ ہوسکی۔ فیس بک پر ادبی سرگرمیوں میں مصروفیت کے باوجود یہ خواہش رہی کہ میرا کلام شائع ہونا چاہیے۔ ابتدائی طور پر برقی صورت میں اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں موجِ غزل کے منتظم اور مکتبہء ارمغانِ ابتسام کی روحِ رواں نوید ظفر کیانی اور روبینہ شاہین بینا صاحبہ کا بے مثال تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس خوب صورت برقی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادبی سفر میں ہمیں کامیاب اور بامراد فرمائے۔ آمین

ہاشم علی خان ہمدم

۷ اگست ۲۰۲۳ء

☆

کیا کہوں ؟ کیا بولتا ہے ؟ آئینہ سچ بولتا ہے
دیدۂ دل کھولتا ہے ، آئینہ سچ بولتا ہے

سب سے پہلے دیکھتا ہے، بات کا معیار کیا ہے؟
پھر ترازو تولتا ہے ، آئینہ سچ بولتا ہے

روشنی کے پھول کھلتے دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں
حرف میں رس گھولتا ہے، آئینہ سچ بولتا ہے

لاکھ پردوں میں رہوں ، پہچانتا ہے، جانتا ہے
میرے اندر بولتا ہے، آئینہ سچ بولتا ہے

عشق کی پرواز کیا ہے؟ حسن کا انداز کیا ہے؟
سوچ کے پر کھولتا ہے ، آئینہ سچ بولتا ہے

نقش جو مٹنے لگا ہے ، عکس جو ڈھلنے لگا ہے
پیش منظر بولتا ہے، آئینہ سچ بولتا ہے

بارگاہِ عشق میں یوں سحر کھلتا جا رہا ہے
اسمِ اعظم رولتا ہے ، آئینہ سچ بولتا ہے

شاعری قرطاس پر کوزہ گری سے کم نہیں ہے
جیسے جادو بولتا ہے ، آئینہ سچ بولتا ہے

میں لرز جاتا ہوں اپنے آپ میں کچھ سوچتے ہی
دل بھی ہمدؔم ڈولتا ہے، آئینہ سچ بولتا ہے

✷

☆

کفِ ادراک پر ٹھہرا ہوا امکان لکھنا ہے
صریرِ خامۂ دل میں با وجدان لکھنا ہے

بہت کچھ اپنے لفظوں میں چھپا لینے کی عادت ہے
کوئی حرفِ ہنر لیکن پسِ دیوان لکھنا ہے

کتابیں تھام کر آؤ قلم بردار چلتے ہیں
وفا کے خون سے ہم نے ہی پاکستان لکھنا ہے

محبت کا علم تھامے جو سب سے پیار کرتے ہیں
مجھے ننھے فرشتوں کو بڑا انسان لکھنا ہے

وجودِ زندگی ٹھہرا جہاں گم نام صحرا میں
بہت سے شہر ایسے ہیں جنہیں ویران لکھنا ہے

مقامِ آدمیت کو میں کس عنوان میں رکھوں
عجب ہے پتھروں کو ہی اگر بھگوان لکھنا ہے

لگے ہیں فکر پر تالے جمی ہے برف جذبوں پر
ملی ہیں چند سانسیں جو انہیں تاوان لکھنا ہے

دسمبر کے دھندلکے سے نکل آؤ مرے ہمدم
مجھے اگلے برس اپنا نیا عنوان لکھنا ہے

☆

ریت کے طوفان سے ناچاقیاں مہنگی پڑیں
دشت میں بہرِ جنوں بے باکیاں مہنگی پڑیں

وقت پڑنے پر سبھی مفلوج ہوتے رہ گئے
زندگی میں اس قدر بے ساکھیاں مہنگی پڑیں

چل پڑے کچے گھڑے اپنا کنارہ چھوڑ کر
بے کراں دریاؤں میں تیراکیاں مہنگی پڑیں

پڑ گئیں پختہ دراڑیں سوچ کی دیوار میں
گھر کے آنگن میں پلی ناچاقیاں مہنگی پڑیں

حوصلہ دل میں نہیں تھا زندگی کے کھیل میں
چل گئیں میدان میں توہاکیاں مہنگی پڑیں

ہم نے جو بویا تھا کل وہ کاٹنے کا وقت ہے
ہم کو اپنی سوچ کی ناپاکیاں مہنگی پڑیں

ایک ہی صف میں کھڑی ہیں دوستوں کی ٹولیاں
دشمنوں کو اس قدر سفاکیاں مہنگی پڑیں

بند ہے چشمِ تماشا، سب کہانی کھل گئی
آئینے کے سامنے چالاکیاں مہنگی پڑیں

عمر بھر کرتا رہا وہ دوسروں کی شادیاں
ایک بھائی کو بہت سی راکھیاں مہنگی پڑیں

ہوش میں رہنے کا اک الزام ہمدم لگ گیا
دامنِ صد چاک میں کچھ ٹاکیاں مہنگی پڑیں

✵

☆

خواب در خواب سرِ دشت پڑی ملتی ہے
زندگی وقت کی راہوں میں کھڑی ملتی ہے

اک ملاقات کا وعدہ ہے تسلی ورنہ
دردِ ہجراں میں کہاں چین گھڑی ملتی ہے

دل کا رشتہ ہے لکیروں کا بہم ہو جانا
سانس در سانس محبت کی لڑی ملتی ہے

میرے آثار بتاتے ہیں زمانہ میرا
میری پہچان تو مٹی میں گڑی ملتی ہے

آ مرے پاس کہ تعبیر بنا لوں تجھ کو
تیری صورت مرے خوابوں سے بڑی ملتی ہے

برف زاروں سے چناروں کی مہک آتی ہے
سرد جذبوں میں محبت بھی جڑی ملتی ہے

کون گزرا ہے سرِ عشق یہاں آبلہ پا
خار زاروں سے جنوں خیز کڑی ملتی ہے

سبز آنچل ہی نہیں سر سے اتر کر الجھا
ایک دستار بھی کیکر سے اڑی ملتی ہے

کوئی تہذیب کو بازار میں تکتا ہی نہیں
جنسِ بے مایہ یہاں مفت دھڑی ملتی ہے

کون دیکھے گیا کتابوں میں اجالی صدیاں
اب تو فٹ پاتھ پہ تاریخ سڑی ملتی ہے

خواب آور ہے وہ احساس بھی خوشبو جیسا
آج تکیے پہ کوئی بیل کڑھی ملتی ہے

راستہ کیسے ملے ان کو سفید آنکھوں سے
جن کو ورثے میں بزرگوں سے چھڑی ملتی ہے

شہر جنگل میں بدلنے کو ببول آئے ہیں
دل کے برگد پہ امربیل چڑھی ملتی ہے

ایک صورت ہے سرِ چشمِ تماشا ہمدمؔ
جس طرف آئینہ رکھا ہو پڑی ملتی ہے

☆

احساس کو یہ عرصۂ ادراک بہت ہے
خوشبو سے مہکتی ہوئی پوشاک بہت ہے

اتنا ہوں تہی دست کہ آنسو نہیں رکتے
گو ساتھ مرے دامنِ صد چاک بہت ہے

تعبیر کا اک تاج محل تجھ سے جڑا ہے
خوابوں کے جزیرے پہ یہ املاک بہت ہے

میں شہرِ گماں زاد سے آگے کا مکیں ہوں
صد شکر مرے دل کی زمیں پاک بہت ہے

دل درد کے ملبے میں نہاں مثلِ شرر ہے
شعلے کے بھڑکنے کو یہی خاک بہت ہے

سینے پہ کبھی وار وہ کر ہی نہیں سکتا
دشمن کے قبیلے پہ مری دھاک بہت ہے

بے نور چراغوں کی ضرورت ہی مجھے کیا؟
حجرے کو میاں ! دیدہ ءنمناک بہت ہے

یہ پردۂ سیمیں ہے کہ آئینۂ ہستی
دِل عشق کے میدان میں بے باک بہت ہے

پانی کو بتا دیتا ہے مٹی کی حقیقت
یہ کچا گھڑا عشق میں تیراک بہت ہے

خوشیوں کو منانے کا ستم کرنا پڑے گا
ہر آنکھ مرے درد پہ نمناک بہت ہے

انجام پہ ہنسنے کا تماشا سا کیا ہے
ورنہ یہ فسانہ مرا غمناک بہت ہے

ممکن ہے کہانی میں کہاں درد کا قصہ
کردار حقیقت میں المناک بہت ہے

سفاک ہواؤں نے اسے طاق کیا ہے
مظلوم مرے شہر کا چالاک بہت ہے

انسان کا کردار کبھی مر نہیں سکتا
ہونے کی گواہی کے لیے خاک بہت ہے

گزرے نہ کبھی تجھ پہ قیامت شبِ ہجراں
کہتے ہیں کہ یہ ہجر خطرناک بہت ہے

یہ کھیل محبت ہے کہ سانسوں کا جوا ہے
بدلے گا کروڑوں میں سوا لاکھ بہت ہے

انسان ہوں میں دید کے قابل ہی کہاں ہوں
سُرمہ ہے سرِ طور یہی راکھ بہت ہے

اے عشق تری خیر کہ بدنام ہوا ہوں
ویسے تو سرِ شہر مری ساکھ بہت ہے

اُلجھا ہے ترا فتنۂ پیچاک نظر سے
ظالم ترا چلنا ہی غضب ناک بہت ہے

صد شکر کہ میں آپ ﷺ کی امت میں جیا ہوں
نسبت ہی مجھے سیدِ لولاک ﷺ بہت ہے

مٹی کا پرندہ ہوں مگر عشق میں ہمدمؔ
اڑنے کو مجھے سینۂ افلاک بہت ہے

☆

بھیگے بدن کی پیاس ہے موجِ بہار میں
کتنی عجیب آس ہے موجِ بہار میں

سر تا قدم ہے پیار میں بھیگا ہوا بدن
بارش مرا لباس ہے موجِ بہار میں

آئینۂ خیال میں صبحِ جمال ہے
کرنوں کا انعکاس ہے موجِ بہار میں

خوشبو مثال ہے ترے احساس کی نمود
تو دل کے آس پاس ہے موجِ بہار میں

پلکوں پہ ارتعاش ہے خوابوں کے رنگ کا
آنکھوں میں اک مٹھاس ہے موجِ بہار میں

اچھے دنوں میں خوف کا ادراک ہے مجھے
دل بھی خزاں شناس ہے موجِ بہار میں

پھولوں کی بود و باش میں کھلتے تو ہیں مگر
کانٹوں پہ اک ہراس ہے موجِ بہار میں

دورِ خزاں کی تشنگی اب تک مٹی نہیں
آدھا بھرا گلاس ہے موجِ بہار میں

کانٹوں کی سر زمین پہ پھولوں کا بانکپن
یارب یہی سپاس ہے موجِ بہار میں

دھرتی کے زرد کھیت میں غنچے ہرے ہوئے
اچھے دنوں کی آس ہے موجِ بہار میں

دشتِ وفا کی وحشتو ! ہمراہ لے چلو
مجھ کو جنوں بھی راس ہے موجِ بہار میں

بادِ صبا سکول کے آنگن میں کیا چلی؟
پھولوں بھری کلاس ہے موجِ بہار میں

یوں ہی نہیں عروج پہ جوشِ جنونِ عشق
کوئی تو دیو داس ہے موجِ بہار میں

پھولوں کا رنگ دیکھ کے ہمدؔم کھلا ہوا
موسم بھی کتنا خاص ہے موجِ بہار میں

☆

بھیگا موسم، رنگ دکھایا بارش نے
جینے کا احساس دلایا بارش نے

دھیرے دھیرے دل دھڑکایا بارش نے
سات سروں میں گیت سنایا بارش نے

جل تھل سوچیں، آنکھیں پانی پانی ہیں
کس دنیا میں آن بسایا بارش نے

کچے گھڑے کی آس پہ کب تک رہتے ہم
دِل دریا میں پار لگایا بارش نے

مدت سے ہم جھیل کنارے بیٹھے تھے
کاغذ کی کشتی کو چلایا بارش نے

پھولوں پر جب اوس پڑی تو جھوم اٹھے
خوشبو پھیلی ، دل مہکایا بارش نے

رنگوں کی بارات میں تیری یاد آئی
قوسِ قزح میں روپ جمایا بارش نے

تیرے لمس کی خوشبو جاگی سانسوں میں
دھڑکن دھڑکن دل گرمایا بارش نے

قطرہ قطرہ مستی بڑھتی جاتی ہے
مجھ کو ایسا جام پلایا بارش نے

بوندوں کی پازیب بجی تو آنکھ کھلی
سویا ہوا ہر خواب جگایا بارش نے

میں نے پوچھا کس کی خاطر برسی ہو
مجھ کو تیرا نام بتایا بارش نے

آنکھوں آنکھوں میں ہم بھی مدہوش ہوئے
ہم پر اپنا کیف لٹایا بارش نے

ورنہ سورج نے تو مار دیا ہوتا
دھوپ نگر میں بخشا سایہ بارش نے

ہاتھ میں ڈالے ہاتھ چلے ہم برسوں بعد
ہمدم اچھا ساتھ نبھایا بارش نے

☆

صدیوں کی زنجیر پڑی ہے پاؤں میں
جیسے کوئی کیل گڑی ہے پاؤں میں

کانٹوں سے میں جان چھڑا کر آیا ہوں
پھولوں کی اک بیل اڑی ہے پاؤں میں

وقتِ رخصت پاؤں باندھے چوم لیے
ایسی بھی انمول گھڑی ہے پاؤں میں

ہم نے اپنا ساتھ نبھانا چھوڑ دیا
دامن سے کچھ خاک جھڑی ہے پاؤں میں

پائے طلب میں چھالے بنتے جاتے ہیں
چلنے سے تکلیف بڑی ہے پاؤں میں

ایک قدم بھی چلنا کیسے ممکن ہو
اک مجبوری آن پڑی ہے پاؤں میں

زنداں نامہ کا دیباچہ کہتا ہے
خاص محبت، پہلی کڑی ہے پاؤں میں

بستی بستی پتھر مجھ سے الجھے ہیں
میں نے کیسی جنگ لڑی ہے پاؤں میں

رستے پر ہیں سارے نقش محبت کے
منزل کی تصویر جڑی ہے پاؤں میں

ملنے سے کب آگے جانا ممکن ہے
گر کر بھی دیوار کھڑی ہے پاؤں میں

جیسے جیسے کانٹے ہمدم کاٹے ہیں
کیکر کی دستار پڑی ہے پاؤں میں

☆

خواہشوں کی دکاں برائے فروخت
آئینے کا جہاں برائے فروخت

کون بولی لگانے آیا ہے؟
نے مرا دل نہ جاں برائے فروخت

کس نے سودا کیا محبت کا؟
کون تھا درمیاں برائے فروخت

کیا ستم ہے کہ خواب ردی میں
ہے مری داستاں برائے فروخت

تجھ پہ نیلام ہو گئے ورنہ
ہم بھلا تھے کہاں برائے فروخت

مفت میں آگ بھی نہیں ملتی
راکھ، شعلہ، دھواں برائے فروخت

چشمِ قاتل سجی سرِ بازار
تیر، نشتر، کماں برائے فروخت

جس جگہ پر مکاں بنانا تھا
لکھ دیا ہے وہاں برائے فروخت

لوگ جانے لگے ستاروں پر
ہو گئی کہکشاں برائے فروخت

جو ہے جیسی بھی ہے متاعِ حیات
رکھ نہ سود و زیاں برائے فروخت

جب سے بدلا مزاج پانی کا
ہے پرانا کنواں برائے فروخت

بک رہا ہے خرید لو ہمدؔم
آدمی کا گماں برائے فروخت

☆

چراغِ دیدۂ تر ہے سراب سے آگے
طلوعِ نورِ سحر ہے سراب سے آگے

مرے جنوں کا سفر ہے سراب سے آگے
کہ آئینے پہ نظر ہے سراب سے آگے

حدودِ خیمۂ جاں سے ابھر کے نکلے گا
ابھی جو مثلِ شرر ہے سراب سے آگے

میں کنجِ شہرِ محبت سے ہو کے آیا ہوں
وہی گلی، وہی گھر ہے، سراب سے آگے

ہوا کے سنگ بگولے کہاں سے اٹھتے ہیں؟
کوئی تو خاک بسر ہے سراب سے آگے

میں آسماں کی بلندی تلک نہیں محدود
مری تو حدِّ نظر ہے سراب سے آگے

میں خواہشوں کا تماشائی ہوں پجاری نہیں
یہی تو ذوقِ نظر ہے سراب سے آگے

کبھی تو دھوپ نگر سے نکل ہی جاؤں گا
مری وفا کا شجر ہے سراب سے آگے

حدودِ عشق بھلا کون ماپ سکتا ہے؟
یہ دشت بارِ دگر ہے سراب سے آگے

نگاہ اٹھتی ہے لیکن پلٹ نہیں سکتی
عجیب کُنجِ سحر ہے سراب سے آگے

نجانے کب سے چلا ہوں میں بے سرو ساماں
مرا تو رختِ سفر ہے سراب سے آگے

کبھی کبھی میں ستاروں کے دیس جاتا ہوں
تمام گردِ سفر ہے سراب سے آگے

یہ میری آبلہ پائی کی سرزمیں تو نہیں
مرا تو دشت نگر ہے سراب سے آگے

فریبِ چشمِ تمنا سے کس طرح نکلوں؟
ہر ایک خواب کا پر ہے سراب سے آگے

یہ نفرتوں کی اسیری یونہی پڑی ہوئی ہے
محبتوں کا نگر ہے سراب سے آگے

میں آسمان کو سر پر اٹھا کے بھاگا ہوں
مجھے زمیں کی خبر ہے سراب سے آگے

میں دشت رات سے پہلے عبور کر لوں گا
مری تو شام و سحر ہے سراب سے آگے

بچھا کے پھول میں رکھتا ہوں ہر قدم ہمدؔم
کہ پا بریدہ سفر ہے سراب سے آگے

☆

مجھ کو اپنوں سے نہ اغیار سے ڈر لگتا ہے
کیوں بدلتے ہوئے معیار سے ڈر لگتا ہے

مجھ کو معلوم نہیں اصل کہانی کیا ہے؟
جھوٹ کہتا ہوں کہ سرکار سے ڈر لگتا ہے

شہرِ ادراک سے میں دور نکل آیا ہوں
اب مجھے اپنے ہی افکار سے ڈر لگتا ہے

اس قبیلے میں کوئی مرد نہیں ہے شاید
جس کے بچوں کو بھی سردار سے ڈر لگتا ہے

خواب دیکھا ہے مگر نیند سے پہلے پہلے
ہجر کے دیدۂ بیدار سے ڈر لگتا ہے

دینا پڑتی ہیں مجھے خون کی بوندیں اکثر
ہاتھ پھیلے ہوں تو انکار سے ڈر لگتا ہے

عمر کچی ہے مری جان! ابھی خواب نہ دیکھ
تیری آنکھوں میں لکھے پیار سے ڈر لگتا ہے

کانپ اٹھتا ہوں میں ماتم کی صدائیں سن کر
ہاں مجھے شام کے اخبار سے ڈر لگتا ہے

قید کرتا ہے مگر فن کو بھی اعزاز کے ساتھ
حاکمِ وقت کو فنکار سے ڈر لگتا ہے

شہر سے دور کی تہذیب کا گہوارہ ہے
شہر کے بیچ میں بازار سے ڈر لگتا ہے

میں بھی مجبور نہ ہو جاؤں مجسم ہو کر
عین چوراہے پہ شہکار سے ڈر لگتا ہے

قوس در قوس لکیروں سے الجھ پڑتی ہے
ہاتھ آئے بھی تو پرکار سے ڈر لگتا ہے

کس کی امید پہ چھوڑوں میں ٹھکانہ اپنا
دور ویرانے میں گھر بار سے ڈر لگتا ہے

میرے دامن میں خزاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
موسمِ گل کے طلب گار سے ڈر لگتا ہے

میں بھی کچھوے کی طرح چال چلے جاتا ہوں
مجھ کو خرگوش کی رفتار سے ڈر لگتا ہے

کون روکے گا ہواؤں کے تھپیڑے ہمدم
گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے ڈر لگتا ہے

☆

ہوا کے ساتھ بدلنے کی بات کرتا ہے
وہ مجھ سے دور نکلنے کی بات کرتا ہے

میں برف زاد نہیں ہوں کہ ٹوٹ جاؤں گا
یہ کون میرے پگھلنے کی بات کرتا ہے

میں جل رہا ہوں مگر روشنی سے ڈرتا ہوں
وہ بے چراغ بھی جلنے کی بات کرتا ہے

محبتوں کی مسافت میں چل نہیں سکتا
وہ ہر گھڑی جو سنبھلنے کی بات کرتا ہے

یہ خواب چشمِ رسا کے بغیر کچھ بھی نہیں
دیا بھی طاق میں جلنے کی بات کرتا ہے

میں خواہشوں کے جزیرے سے دور رہتا ہوں
مگر یہ دل کے مچلنے کی بات کرتا ہے

وہی تو شہر کا سب سے بڑا پجاری ہے
جو آفتاب کے ڈھلنے کی بات کرتا ہے

یہ کیا کہ پاؤں پڑا ہے مرے کنارے پر
جو موج اچھلنے کی بات کرتا ہے

تراشتا ہے جو پتھر بھی تیشۂ دل سے
عجیب ہے کہ پھسلنے کی بات کرتا ہے

وہ میرے ہجر سے واقف ابھی نہیں ہمدؔم
عذاب دے کے جو ٹلنے کی بات کرتا ہے

✵

☆

جن کو دیکھے ہوئے لگتا ہے زمانے ہوئے ہیں
ایسے کردار فسانے میں پرانے ہوئے ہیں

وسعتِ ہجر میں کھوئے ہوئے پنچھی اڑ جا
ہم تو ان خواب جزیروں میں پرانے ہوئے ہیں

تار در تار سرِ اشک نمو پاتے ہیں
خواب پلکوں کے دریچے میں جو تانے ہوئے ہیں

ایسی رفتار سے چلتے ہیں کہ پیچھے ہی رہیں
دھوپ نگری میں تو سائے بھی سیانے ہوئے ہیں

چار تنکے جو سرِ شاخ سجا بیٹھا ہوں
میری چھاؤں میں پرندوں کے ٹھکانے ہوئے ہیں

قیس در قیس قبیلہ ہے، چلا آتا ہے
دشت آباد سرِ عشق دوانے ہوئے ہیں

ہم اگر کھیل بھی جائیں تو جوا ہاریں گے
ایک مدت سے تری جیت کو مانے ہوئے ہیں

پھر یہ تجدید محبت کا تقاضا کیا؟
ہم تو پہلے ہی تری ذات کو مانے ہوئے ہیں

عمر گزری ہے چراغوں کو اجالا کرتے
طاق در طاق ترے شہر کو چھانے ہوئے ہیں

جس کے ارمان کسانوں نے سجائے دل میں
سبز کھیتی میں اسی رنگ کے دانے ہوئے ہیں

خواب رکھے تھے کہیں دور شبستانوں میں
آنکھ کھلتے ہی ترے ہاتھ سرہانے ہوئے ہیں

جن کو ہم ڈھال بنائے ہوئے لڑتے تھے کبھی
تیر چلتے ہی وہی لوگ نشانے ہوئے ہیں

چل مرا بوجھ اٹھا ساتھ کہیں چلتے ہیں
زندگی درد سے بوجھل مرے شانے ہوئے ہیں

تجھ کو معلوم کہاں اپنی حقیقت ورنہ
لوگ مجھ کو بھی ترے نام سے جانے ہوئے ہیں

تیرا کردار کہانی میں رہا ہے ہمدم
تجھ سے منسوب مرے خاص فسانے ہوئے ہیں

☆

پھولوں کی زندگی میں غزل ہونی چاہیے
خوشبو کی شاعری میں غزل ہونی چاہیے

قوسِ قزح کی دھوپ میں کرنیں اجال کر
رنگوں کی روشنی میں غزل ہونی چاہیے

میں بحرِ ممکنات میں صدیوں کی پیاس ہوں
موجوں کی تشنگی میں غزل ہونی چاہیے

سر، تال، نغمگی میں سبھی راگ رنگ ہوں
آہنگِ خسروی میں غزل ہونی چاہیے

اسلوب، طرز، بندشِ الفاظ چست ہوں
پھر سوچ کی لڑی میں غزل ہونی چاہیے

ہو منصۂ شہود پہ آمد شعور کی
احساس کی گھڑی میں غزل ہونی چاہیے

ہر غنچۂ جمال سے مصرعہ کشید ہو
ہر پھول کی کلی میں غزل ہونی چاہیے

سورج پلٹ کے آئے تو نورِ سحر ملے
ہر شب کی تیرگی میں غزل ہونی چاہیے

آئینۂ وجود میں کچھ تو دکھائی دے
پھر عالمِ خودی میں غزل ہونی چاہیے

مطلع حسیں خیال کا مقطع بنا رہے
میری بھی زندگی میں غزل ہونی چاہیے

بارش حسین روپ ہے موجِ بہار کا
ساون کی اس جھڑی میں غزل ہونی چاہیے

پہلے تو بے خودی کے معانی اریدہوں
پھر ذوقِ آگہی میں غزل ہونی چاہیے

آواز کے لباس میں چھپنا محال ہے
کہتے ہیں ان کہی میں غزل ہونی چاہیے

کیا موجۂ شعور کا پندار توڑ دوں؟
کیا ذات کی کمی میں غزل ہونی چاہیے؟

یا حسن کے دیار میں نغمہ سند کریں
یا عشق کی گلی میں غزل ہونی چاہیے

اسلوب آج بھی ہے وہی طرزِ میر میں
اندازِ میر ہی میں غزل ہونی چاہیے

یا محشرِ خیال میں غالب کی بات ہو
یا طرزِ مصحفی میں غزل ہونی چاہیے

موجِ خیال و خواب سے باہر نکل سکوں
مٹی کی جل پری میں غزل ہونی چاہیے

دھڑکن کے بیچ پیار کا رشتہ دوام ہے
دونوں کی دل لگی میں غزل ہونی چاہیے

شیشے کی کائنات میں جینے کے واسطے
پتھر کے آدمی میں غزل ہونی چاہیے

یا رب مری نگاہ کو چشمِ غزال دے
دیکھوں جسے اسی میں غزل ہونی چاہیے

چھیڑے نہ دل کے تار تو کہنے سے پیش تر
ردی کی ٹوکری میں غزل ہونی چاہیے

ہمدؔم اسی گمان میں تارے تلاش کر
جگنو کی روشنی میں غزل ہونی چاہیے

☆

احساس کے تیشے سے نکالا ہوا پتھر
ہے عشق مرے ہاتھ کا پالا ہوا پتھر

افلاک کے آنگن سے اتارا ہوا جگنو
میں چاند ستاروں میں اجالا ہوا پتھر

ترسی ہوئی آنکھوں میں سرابوں کا فسانہ
پانی میں بڑی دیر سے ڈالا ہوا پتھر

اے دست سخن ساز تجھے زیب نہیں ہے
الفاظ کے کیچڑ سے نکالا ہوا پتھر

شاید مرے اعمال کا یہ ردعمل ہے
لگتا ہے مرے سر پہ اچھالا ہوا پتھر

جو پھول کی صورت میں ترے ہاتھ سے آیا
رکھا ہے مرے دل میں سنبھالا ہوا پتھر

یہ آگ تو صدیوں سے لگائی ہے کسی نے
یوں ہی تو نہیں دھوپ میں کالا ہوا پتھر

سب لوگ اسے میری طرف پھینک رہے ہیں
گرتا ہے مرے گھر میں وہ ٹالا ہوا پتھر

پتھر کی حقیقت کسی آذر کو پتا ہے
تیشے کی حقیقت کا حوالہ ہوا پتھر

مزدور نے مٹی کو فقط خون کیا تھا
مٹی سے نکل ہاتھ کا چھالا ہوا پتھر

اِک عمر سے بچھڑا ہوا ہم زاد ملا تو
شیشے میں لگا گرد سے جالا ہوا پتھر

دامن سے گریبان تلک مار کرے گا
یہ لفظ ہے تہذیب کا پالا ہوا پتھر

برسا ہے کئی بار مری ذات پہ ہمدؔم
آئینہء ادراک میں ڈھالا ہوا پتھر

☆

صدائے موجۂ گل نے جو شاعری کی ہے
مرے شعور کی کھیتی ہری بھری کی ہے

ملے گی عشق سے پنشن بھی تا حیات مجھے
تمام عمر عقیدت سے نوکری کی ہے

یہ کارواں نہ لٹے تو ہماری قسمت ہے
قدم قدم پہ لٹیروں نے رہبری کی ہے

شریکِ جرم ہیں سارے انا پرستی میں
ہمارے عہد کے سورج نے مخبری کی ہے

یہ دو گھڑی کی رفاقت ضرور تھی لیکن
ہوئی ہے ہم سے جو ممکن کھری کی ہے

ملا ہے صبر کا وہ پھل بتا نہیں سکتا
ہر ایک کام میں اللہ نے بہتری کی ہے

ٹھٹھر رہی ہے دریچے میں سانس تھامے ہوئے
مرے خیال کی تصویر بھی مری کی ہے

ہے فاختاؤں کا آنچل ہرا بھرا رکھنا
یہ زرد زرد سی ٹہنی ابھی ہری کی ہے

نظر میں چاند ستارے بھی کاڑھ رکھے ہیں
تمام رات فلک پر جو زرگری کی ہے

حقیقتوں کا فسانہ ہے خاک زادی کا
خیال و خواب کی دنیا کسی پری کی ہے

خدا نے جس کو بنایا ہے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
اسی نے دونوں جہانوں پہ سروری کی ہے

وہ خد و خال اتارے ہیں شعر میں ہمدم
ادائے حسنِ غزل میں مصوری کی ہے

☆

دیارِ شب میں اندھیرا اب جلنے والا ہے
سحر کا خواب ستارہ نکلنے والا ہے

بجھا رکھا ہے جسے ہم نے طاقِ نسیاں میں
وہی چراغ تو آنکھوں میں جلنے والا ہے

اڑا رہے ہیں مری خاک میرے کوزہ گر
مرا وجود تخیل میں ڈھلنے والا ہے

جو پل رہے ہیں قبیلے کی آستینوں میں
مرا خلوص انہیں بھی کچلنے والا ہے

لو آرہا ہے کوئی پھول بیچنے والا
ہمارے شہر کا موسم بدلنے والا ہے

جنوں سمیٹ کے لائی ہے موج دامن میں
بھنور کے ساتھ کنارہ بھی چلنے والا ہے

فریبِ خواہشِ دنیا ہے آج بھی دل میں
یہ نامراد ابھی تک مچلنے والا ہے

ہیں برف برف سے جذبے گداز قربت میں
شبِ وصال وہ پتھر پگھلنے والا ہے

یہی عروج ہے اس پر غرور مت کرنا
یہی مقام نگاہوں میں کھلنے والا ہے

لگے گا شام سرائے میں آخری خیمہ
ترے خیال کا سورج بھی ڈھلنے والا ہے

گھنا کیے ہے اندھیروں کو یہ شجر لیکن
اسی کے سائے میں جگنو بھی پلنے والا ہے

عجیب کایا کلپ ہے یہ آگہی ہمدم
مرا شعور مجھے ہی نگلنے والا ہے

☆

تم دشتِ اعتکاف میں محصور ہو گئے
ہم عین شین قاف میں منصور ہو گئے

شہرِ جنوں کی وحشتیں چھوڑیں نہیں مگر
تہذیب کے غلاف میں مستور ہو گئے

وہ کعبۂ وجود میں ٹھہریں گے کیا بھلا
جو پہلے ہی طواف میں معذور ہو گئے

سقراط کے مرید ہیں بادہ لیے ہوئے
یوں سچ کے اعتراف میں مخمور ہو گئے

قوسِ قزح کے رنگ ہیں سورج کی دھوپ میں
چمکے جو انعطاف میں منشور ہو گئے

شدت پسند شہر کو باغی پسند تھے
سو ہم بھی انحراف میں مشہور ہو گئے

ہم بھی انا پرست تھے ہمدم نہ مل سکے
آپس کے اختلاف میں مجبور ہو گئے

✵

☆

جسے زنگار سمجھا تھا اسیرِ گرد نکلا ہے
پرانا آئینہ آخر مرا ہم درد نکلا ہے

مرے اجداد کا خوں بھی رہا شامل وراثت میں
زمیں نیلام کرنے میں حریمِ فرد نکلا ہے

رہے ہیں پھول کی خوشبو سے بھی محروم گلشن میں
ہماری سرخ مٹی سے شگوفہ زرد نکلا ہے

وفا کی دھوپ نگری میں پکڑتا ہے مرے پاؤں
جسے غم خوار سمجھا تھا وہی بے درد نکلا ہے

چلے ہیں آگ لینے کو ترے شہرِ تمازت میں
ہماری آرزوؤں کا علاقہ سرد نکلا ہے

لو میں نے اعتبارِ دل ! بچا رکھا ! تجھے سونپا
مرے کردہ گناہوں میں یہی ناکردہ نکلا ہے

مری آنکھوں نے دیکھا ہی نہیں تھا جس کو محفل میں
مجھے اپنا بنانے میں وہی تو فرد نکلا ہے

عدو سے چھین لایا ہے وہ دستارِ زمانہ بھی
مرے بزدل قبیلے میں کوئی تو مرد نکلا ہے

کیا ہے آخری حملہ وفا کی آستینوں پر
جسے بھی مارنا چاہا وہی نامرد نکلا ہے

صدا آمد ہوئی مجھ کو محبت کے جزیروں سے
سمندر کے کلیجے سے مرا آورد نکلا ہے

ہماری خاک نے ہمدم کیا رقصِ جنوں ایسا
ہوا کا زور ٹوٹا تو بگولا گرد نکلا ہے

☆

فضول مشق سخن بھی نری جگالی ہے
کہ لاشعور میں اپنی غزل چرالی ہے

یہ کچی ڈور کا رشتہ مری اڑان میں تھا
مری ترنگ پتنگوں نے کیوں اڑالی ہے

کلی کلی کو چھوا ہے شریر تتلی نے
ہر ایک پھول میں رنگوں نے جان ڈالی ہے

خدا کرے کہ یہ دانے سفید ہو جائیں
ہری زمین پہ گندم کی سبز بالی ہے

پھسل رہا ہے ملیدہ ادھر ادھر ورنہ
یہ خاکدان تو مٹی کی ایک تھالی ہے

مری نظر سے بھی زیادہ حسین ہے صاحب
فریبِ چشمِ غزالاں سراب حالی ہے

یہ زندگی تو خسارے کا نقد سودا ہے
کہ فصل بونے سے پہلے تمام کھالی ہے

جگہ نہیں ہے مسافر مری حویلی میں
کرائے کے لیے سارا مکان خالی ہے

مرا وجود بھی تسلیم ہو رہا ہے کہیں
مری نوائے سخن کا جواب تالی ہے

جو بک رہا ہے ٹماٹر کے بھاؤ منڈی میں
اسے تو گند کی قیمت بھی ایک گالی ہے

حقیقتوں کے جزیرے میں کچھ نہیں ملتا
خیال وخواب کی جنت الگ بنالی ہے

کسی کا ساتھ نبھانا بہت ضروری تھا
کسی کے پیار میں سچی قسم اٹھالی ہے

میں پانیوں میں ستارے اچھال سکتا ہوں
دیے کی لو سے نئی روشنی نکالی ہے

اسی پہ لڑتے ہیں بچے بڑوں کے لڑنے تک
گلی کے موڑ پہ پانی کی تنگ نالی ہے

بہت جچا ہے اسے یہ ملال کا موسم
سفید سر پہ دوپٹہ ، قمیض کالی ہے

عجب وقار سے کرتا ہے خدمتِ یاراں
ترا فلاحی ادارہ بڑا مثالی ہے

کوئی مذاق بھی سنجیدگی سے ہو ہمدم
سو انحراف کی صورت یہی نکالی ہے

☆

مرے خلوص کے آگے انا بھی رد کردی
کسی نے اپنی محبت مری سند کردی

تمام عمر سنبھالے گئے نہ مجھ سے قدم
ترے جنوں نے جوانی جو بے خرد کردی

کسی نے حرفِ تکلم سے مجھ کو زیر کیا
بڑھائی حرف کی قیمت تو شدّ و مد کردی

بس ایک بار کہا تھا اٹھاؤ میری قسم!
پھر اس کے بعد وہ صدمے اٹھائے، حد کردی

مرا مقام بڑھایا ملائکہ سے یوں
مری سرشت ہی مولا نے نیک و بد کر دی

میں لامکان سے نکلا تو لا مکاں ہی رہا
ازل سے اپنی جدائی مجھے ابد کر دی

جہاں بھی میں نے یہ سمجھا کہ بت کدے میں ہوں
وہیں پہ میں نے صدائے احد احد کر دی

ہر ایک شعر میں بکھری ہیں صورتیں کتنی
زمینِ حسنِ غزل ہی جو خال و خد کر دی

شعورِ ذات سے پہلے کی بات ہے لوگو!
خدا نے مجھ کو بنایا، بنا کے حد کر دی

مرے یقین کا محور ہے وہ رحیم و کریم
لیا جو نام خدا کا ، وہیں مدد کر دی

صریرِ قلب سے کی تھی ارید موجِ سخن
کہی سنی نہ کسی نے تو مسترد کر دی

گھرا ہوا تھا میں بونوں کے شہر میں ہمدمؔ
سو میں نے اپنی محبت دراز قد کر دی

☆

مطلع میں غزل پوش کی تشبیب کہاں ہے؟
اب دل کے قصیدے میں وہ تہذیب کہاں ہے؟

پتھر مری بنیاد کے کیوں ہلنے لگے ہیں
تعمیر شدہ شہر میں تخریب کہاں ہے؟

میں شہر کا اخبار ہوں مت جھوٹ سمجھنا
سچی ہے الٹ بات، یہ تکذیب کہاں ہے؟

وہ گھر تو چراغوں میں دکھائی نہیں دیتا
روشن ہیں جہاں لوگ وہ تقریب کہاں ہے؟

الجھے ہوئے منظر ہیں سرِ چشم دریدہ
آئینۂ ادراک میں ترتیب کہاں ہے؟

لکھا ہے مرا نام سرِ لوحِ زمانہ
معلوم نہیں اب مری تنصیب کہاں ہے؟

سرخی مرے ماضی کی یہاں گھلنے لگی ہے
یہ خونِ مکافات ہے، تادیب کہاں ہے؟

احساس مرا خام ہے قرطاس پہ ہمدؔم
یہ حرفِ سخن حسنِ اسالیب کہاں ہے؟

☆

ہری زمین پہ کھلتے ہیں پھول صدیوں سے
کہیں کہیں ہیں مگر کچھ ببول صدیوں سے

یہ خاک میرے بزرگوں کے نقشِ پا کی ہے
ہوائیں چاٹ رہی ہیں جو دھول صدیوں سے

یہ ارتقائے زمانہ ہے یا ترقی ہے
بدل رہے ہیں جہاں کے اصول صدیوں سے

یہ حرف حرف قصیدہ مرا فسانہ ہے
کفِ سخن پہ رہا جو نزول صدیوں سے

نہ جانے کب سے ملائے گئے ہیں آب و گل
نہ جانے کیسے ہوا میں حلول صدیوں سے

وہ خواب زاد جزیروں سے ماورا ٹھہرا
تلاشتے ہو جسے تم فضول صدیوں سے

بھٹک گئے تھے یقیں اور گمان کے اندر
بھگت رہے ہیں زمانے کی بھول صدیوں سے

مجھے جدید نہ سمجھو روایتی ہوں میں
رہی ہے زندہ روایت قبول صدیوں سے

مرے یقین کا محور وہی ہے تازہ کلام
وہی جو کہتے رہے ہیں رسول صدیوں سے

زمیں کی حد سے نکلنے میں دیر ہے کتنی
مرے مدار نے پکڑا ہے طول صدیوں سے

ازل سے غم کا مداوا کیے گیا انساں
یہ کائنات مگر ہے ملول صدیوں سے

مرے خمیر نے پائی اکادمی ہمدؔم
مرا شعور گیا ہے سکول صدیوں سے

☆

پھولوں کا خوش رنگ لبادہ ہو سکتا ہے
خوش بو زادہ اور بھی سادہ ہو سکتا ہے

گھر سے دوری ہجر کا باعث بن سکتی ہے
ہجرت کا ڈر اور زیادہ ہو سکتا ہے

سچی باتیں زہر میں گھولی جا سکتی ہیں
پینے کو سقراط کا بادہ ہو سکتا ہے

خودرو پودے بانجھ زمیں پر اگ آتے ہیں
بے موسم بھی سبز لبادہ ہو سکتا ہے

پھر سکتا ہے حسن کجا وہ ناقے پر بھی
صحرا صحرا عشق پیادہ ہو سکتا ہے

دھڑکن دھڑکن برقی رو میں بہہ سکتی ہے
دل کے اندر عشق کا مادہ ہو سکتا ہے

سرحد پر آزاد پرندے دیکھ رہا ہوں
دشمن کا کچھ خاص ارادہ ہو سکتا ہے

کم لفظوں میں کام کی باتیں ہو سکتی ہیں
پیچیدہ انداز بھی سادہ ہو سکتا ہے

زندہ لاشیں شہر کے اندر گھوم رہی ہیں
بوری میں کچھ اور برادہ ہو سکتا ہے

ہاتھوں میں پستول ہے سر میں گولی ہے
مرنے والا شہر کا دادا ہو سکتا ہے

پھر سے اپنی نقل اتاری جا سکتی ہے
پھر سے ہر کردار اعادہ ہو سکتا ہے

نگری نگری ڈھونڈ رہا ہوں منزل اپنی
ہاتھوں میں تقدیر کا جادہ ہو سکتا ہے

کانٹوں کی بھرمار سے جنگل پھیل رہے ہیں
پھولوں کا کردار بھی آدھا ہو سکتا ہے

ہم نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہے
اب تو ہمدؔم وصل کا وعدہ ہو سکتا ہے

☆

دیکھا نہیں جو غور سے بے کار ہو گیا
آئینۂ جمال بھی زنگار ہو گیا

بدنام کہہ کے شہر سے پھینکا گیا جسے
آباد اس مکان میں بازار ہو گیا

سرخی بغیر کوئی بھی چھپتی نہیں خبر
نوحہ ہمارے عہد کا اخبار ہو گیا

کہتا ہوں جھوٹ موٹ میں لیکن کھری کھری
سچ تو یہی ہے جھوٹ ہی معیار ہو گیا

چپ چاپ دل کی آنکھ سے دیکھے گئے اسے
خاموشیوں میں پیار کا اظہار ہو گیا

منفی مرے وجود کا پہلا یقین تھا
مثبت کیا تو کفر کا انکار ہو گیا

آنکھوں نے دستخط کیے دھڑکن کی مہر پر
پلکیں جھکیں تو عشق کا اقرار ہو گیا

کانٹوں سے تار تار ہیں آنچل اڑے ہوئے
کیکر سرشت صاحبِ دستار ہو گیا

اتری تھی چاندنی ترے خوابوں کی جھیل میں
پانی میں عکس دیکھ کے دیدار ہو گیا

وہ جس کی اینٹ اینٹ پہ مرحب کو ناز تھا
خیبر بنام حیدرِ کرارؓ ہو گیا

ایسا لڑا غنیم سے بدر و حنین میں
اسمِ علیؓ بھی رونقِ تلوار ہو گیا

بنتی نہیں ہے عشق میں ہجرت کیے بغیر
گویا کہ عشق ہجر کا آزار ہو گیا

موجِ ہوا سے بام پہ الجھا ہے بار بار
جلتا ہوا چراغ بھی دیوار ہو گیا

رکھا ہے کاڑھ کاڑھ کے ہمدؔم غزل غزل
باغِ سخن کا پھول بھی شہکار ہو گیا

☆

دشتِ خیال و خواب کے پندار سے گئے
ٹوٹے تو آئنے در و دیوار سے گئے

بونا قدوں کے شہر میں اونچے رہے مگر
ہم اپنے ہی مقام کے معیار سے گئے

منظر تمام چھپ گئے شیشے کی باڑ سے
عینک لگی تو دھوپ کی دیوار سے گئے

غیروں کو اپنے عہد کی دستار سونپ کر
ہر قول ، ہر قرار کے انکار سے گئے

وہ جن پہ واقعات کا دار و مدار تھا
افسانۂ حیات میں کردار سے گئے

سوئے تھے ایک شخص کو پلکوں پہ کاڑھ کر
آنکھیں کھلیں تو خواب کے دیدار سے گئے

محبوب سے یہ آخری عہدِ وصال تھا
لو آج ہم بھی ہجر کے آزار سے گئے

یوسفؑ نہیں تھے وقت کے بے مول ہی بکے
قیمت لگی تو مصر کے بازار سے گئے

پسپا ہوئے فصیل پہ اپنوں کو دیکھ کر
ہم سازشوں کی جنگ میں تلوار سے گئے

اے دل جنونِ عشق میں تو ہی نیا نہیں
کتنے ہی لوگ جبّہ و دستار سے گئے

مہنگا پڑا ہے چاک پہ خود کو سنوارنا
کوزہ گری کے شوق میں شہکار سے گئے

سڑکیں بنیں تو وقت کا پہیہ بدل گیا
ہم گاؤں چھوڑ شہر میں رفتار سے گئے

باغ و بہار دیس کا ماحول کیا ہوا
رستے تمام شہر کے اشجار سے گئے

موجِ بہار آ گئی کانٹوں کے ہاتھ میں
خوشبو لباس پھول بھی گلزار سے گئے

سچے رہے تو نوکری پنشن کے ساتھ ہے
جھوٹے پڑے تو عشق کے دربار سے گئے

جدت روی نے پاؤں سے ہمدم پکڑ لیا
موجِ غزل سرائے میں اظہار سے گئے

☆

احساس کی دنیا میں کہیں آگ لگی ہے
جلتی ہے مرے دل کی زمیں آگ لگی ہے

اترا ہے کوئی چاند ابھی جھیل کنارے
پانی ہے مگر میرے تئیں آگ لگی ہے

مٹی کی حرارت سے پگھلتا ہے زمانہ
اے شعلہ نفس خاک نشیں آگ لگی ہے

خوش تاب ہواؤں نے مجھے دل سے چھوا ہے
بوسہ ہے سرِ لوح جبیں آگ لگی ہے

ماچس پہ اجارہ ہے ابھی دستِ عدو کا
ایندھن ہیں مرے گھر کے مکیں آگ لگی ہے

کانٹوں سے بھری سیج شبِ وصل ملی تھی
بستر پہ مرے خواب گزیں آگ لگی ہے

کشمیر جسے جنتِ ارضی کا لقب تھا
حالات کے دوزخ میں وہیں آگ لگی ہے

بے نور دھندلکے سے نمودار شرر ہیں
اٹھتا ہے دھواں یوں ہی نہیں آگ لگی ہے

یوں سرد ہواؤں سے دھڑکتا ہے مرا دل
برفاب چناروں کے قریں آگ لگی ہے

آئینۂ بے باک سے الجھے ہیں نظارے
کہسار کے دامن میں حسیں آگ لگی ہے

مسلک ہیں، تفرقے ہیں، کہیں نام ونسب ہیں
بدنام کیے کلمۂ دیں آگ لگی ہے

تم نے ہی لگائی تھی مرے دل میں جو ہمدم
اب آ کے بجھاؤ نا! یہیں آگ لگی ہے

☆

بر سرِ عشق فسوں ہے ، یوں ہے
زندگی ایک جنوں ہے ، یوں ہے

فرض ہوتی ہے محبت یوں ہی
کون کہتا ہے کہ یوں ہے، یوں ہے

چاک در چاک غزل ہے میری
شاعری موجۂ خوں ہے، یوں ہے

خام ہوتے ہیں سہانے سپنے
خواب زدگی بھی زبوں ہے، یوں ہے

خواب منظر میں دکھاؤں کیسے
آئینہ دل کے دروں ہے، یوں ہے

ہے یہ ہنگامہ ء محشر لیکن
دل کی دنیا میں سکوں ہے، یوں ہے

سرفرازی میں اٹھا سجتا ہے
سر جو سجدے میں نگوں ہے، یوں ہے

سات دریا ہیں سمندر جیسے
ہجر پانی کا ستوں ہے، یوں ہے

نامکمل ہے فسانہ ہمدؔم
کوئی کردار بروں ہے ، یوں ہے

☆

نیلی چھتری ، بارش ، میں اور تو
اک دوجے کی خواہش میں اور تو

پھولوں کی پگڈنڈی جیسا پل
چلنے کی گنجائش میں اور تو

ساون کی بھیگی مستی کا ڈر
ہلکی ہلکی لغزش میں اور تو

سانسوں کے گنجل میں برقی رو
سرگم جیسی لرزش میں اور تو

کمرے میں جلتی شمع کی لو
جذبوں کی گرمائش میں اور تو

سرگوشی میں شعر سناتا دل
مصرع مصرع بندش میں اور تو

دھڑکن سے اٹھتی آواز کی لے
دل کی ایک گزارش میں اور تو

خواب نگر میں کھوئے کھوئے پل
آنکھوں کی فرمائش میں اور تو

چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں مصروف
غم کی ایک کشائش میں اور تو

نیلی رُت میں خوشبو کا منظر
موسم کی زیبائش میں اور تو

کلیوں سے کھلتے تتلی کے پر
گلشن کی آرائش میں اور تو

ست رنگی موسم ہے تو ہمدم
رنگوں کی آمیزش میں اور تو

☆

کتنی چپ چاپ سی لگتی ہیں سہانی شامیں
روز لکھتی ہیں مرے دل پہ کہانی شامیں

گھر میں آسیب زدہ خوف کا سناٹا ہے
یاد آتی ہیں تو ڈستی ہیں پرانی شامیں

دھوپ ڈھلتے ہی میں صحرا کو نکل پڑتا ہوں
مجھ کو پاگل کیے رکھتی ہیں دوانی شامیں

ہاتھ میں ہاتھ لیے ساتھ چلا کرتے تھے
یاد ہیں مجھ کو ترے ساتھ بتانی شامیں

آئینہ ساز محبت نے سکھایا مجھ کو
آنکھ سورج سے ملانا تو چرانی شامیں

دھوپ نگری میں یہی بوجھ لیے پھرتا ہوں
اچھی لگتی ہیں سرِ دوش اٹھانی شامیں

یاد آتے ہیں مجھے ساتھ نبھانے والے
بھول سکتا ہوں کہاں روز منانی شامیں

ڈھلتا جاتا ہے مری عمر کا سورج ہمدؔم
مجھ سے چھینے لیے جاتی ہیں جوانی شامیں

✵

☆

میں نے کہا! کیوں دوریاں؟ تو نے کہا! مجبوریاں
ہائے مری مجبوریاں ! ہائے تری مغروریاں

نیلی رتوں کی پیاس ہیں ! خوشبو بھرا احساس ہیں
سپنے ترے ہیں تتلیاں ! یادیں تری کستوریاں

گر جی گئے تو خوب ہے! مر بھی گئے تو خوب تر
لے کے چلیں گے عشق میں نامِ خدا مجبوریاں

یا بے ستوں کی شکل میں شیریں سخن آمیز تھی
یا تیشۂ فرہاد نے کیں بے سبب مزدوریاں

کھائیں تھیں ہم نے بانٹ کر اک دوسرے کے ہاتھ سے
مجھ کو بھی اب تک یاد ہیں میلے کی حلوہ پوریاں

یہ داستانِ حسن ہے یا عشق کی وارفتگی
رانجھے نے کھائیں ہیر کے ہاتھوں سے میٹھی چوریاں

ورنہ مری اوقات کیا ؟ حرفِ سخن ! ادراک کیا؟
شعر و غزل کے باب میں ہمدؔم ہوئیں مشہوریاں

✸

☆

خاک زادے جہاں سے باہر ہیں
آئینے بھی وہاں سے باہر ہیں

کس نے بدلا مرے نشانے کو
تیر سارے کماں سے باہر ہیں

ہم پہ لازم نہیں ابھی اڑنا
ہم ابھی آسماں سے باہر ہیں

خواب زدگی میں کھو گئے جو بھی
شہرِ وہم و گماں سے باہر ہیں

پیڑ پر سانپ کا بسیرا ہے
گھونسلے آشیاں سے باہر ہیں

ہم بھی اپنے عجیب سائے ہیں
دھوپ میں سائباں سے باہر ہیں

تیرتی ہیں لطیف موجوں پر
کشتیاں بادباں سے باہر ہیں

خار زاریں نصیب ہیں ان کا
پھول جو گلستاں سے باہر ہیں

مفت سودا کیا محبت کا
ہم تو سود و زیاں سے باہر ہیں

جن کا کردار مرکزی رکھا
اب وہی داستاں سے باہر ہیں

کچھ دیے طاق پر پڑے ہوئے ہیں
کچھ دیے خاکداں سے باہر ہیں

خود کلامی کلام ہے ہمدؔم
لفظ میرے بیاں سے باہر ہیں

☆

بے نور چراغوں سے دھواں اٹھنے لگا ہے
مٹی سے کوئی اور جہاں اٹھنے لگا ہے

اٹھنا ہے تجھے چاند ستاروں سے بھی آگے
اے خوابِ سحر زاد کہاں اٹھنے لگا ہے

سیلاب کا منظر ہے کہ خوابوں کا جزیرہ
بہتے ہوئے پانی پہ مکاں اٹھنے لگا ہے

یہ سود خسارہ ہے نفع ہو نہیں سکتا
سودائے محبت میں زیاں اٹھنے لگا ہے

جب سے میں تجھے جانِ غزل پڑھنے لگا ہوں
کچھ اور مرا زور بیاں اٹھنے لگا ہے

تخریب سے تعمیر کا انداز عیاں ہے
تاریخ کے چہرے سے نشاں اٹھنے لگا ہے

ویران سے منظر ہیں صنم خانۂ دل میں
دھڑکن میں کوئی روحِ رواں اٹھنے لگا ہے

مہمیز فضائیں ہیں سرِ چشم تمنا
آنکھوں میں محبت کا سماں اٹھنے لگا ہے

کس پھول نے دیکھا ہے محبت کی نظر سے
خوشبو سے مرا کوچۂ جاں اٹھنے لگا ہے

الجھے ہیں، لکیروں نے نیا موڑ لیا ہے
ہاتھوں سے مقدر کا نشاں اٹھنے لگا ہے

وحشت ہے فضاؤں میں ابھی ظلمتِ شب ہے
پھر دور کہیں شورِ سگاں اٹھنے لگا ہے

ہاں عشق روایت سے کہیں دور پڑا ہے
کہتے ہیں جسے سنگِ گراں اٹھنے لگا ہے

تعبیر ابھی دور بہت دور پڑی ہے
خوابوں کی سفارت میں گماں اٹھنے لگا ہے

قرطاس کے سینے میں عجب آگ بھری ہے
شعروں سے کوئی شعلہ فشاں اٹھنے لگا ہے

دل درد کی لذت سے شناسا نہیں ہمدمؔ
یہ کیا ہے جو سینے میں نہاں اٹھنے لگا ہے

☆

الوداع ماہِ دسمبر، سالِ نو خوش آمدید
موسمِ گل، بادہ ءتر، سالِ نو خوش آمدید

گردشِ ایام بھی کیفِ شعورِ ذات ہے
ہے یہی رقصِ قلندر، سالِ نو خوش آمدید

ہر قدم آغاز ہے اک خواب کی پرواز کا
خواہشوں کا ہے سمندر، سالِ نو خوش آمدید

دیکھیے کیا رنگ لائے میرے ہاتھوں کی لکیر
آزمانا ہے مقدر، سالِ نو خوش آمدید

آس کی سونی منڈیروں پر نیا پیغام ہے
آن بیٹھا ہے کبوتر، سالِ نو خوش آمدید

وقت کے قرطاس پر خوشبو بھرا احساس ہے
آرزو کے شوخ پیکر، سالِ نو خوش آمدید

زندگی کے ساز پر ہمدم نوائے حرف ہے
روشنی چمکی مرے گھر، سالِ نو خوش آمدید

☆

کسی نے کچھ نہیں دیکھا، غلط فہمی!
یہاں پر ہے سبھی اچھا، غلط فہمی!

ہمارا دھوپ کا رشتہ حقیقت ہے
ہمارے جسم کا سایہ، غلط فہمی!

کنارا مل گیا ہوگا سمندر میں!
اترتا ہے کہاں دریا؟ غلط فہمی!

روانی میں کہا ہے کچھ، سنا ہے کچھ
نہیں دیکھا، نہیں سمجھا، غلط فہمی!

خرابے میں ہوا کے کان کچے ہیں
کہا ہے کیا؟ سنا ہے کیا؟ غلط فہمی!

سبھی کردار جھوٹے ہیں فسانے میں
ہوا کچھ بھی نہیں گویا ! غلط فہمی!

ہمارے سامنے آتے ہیں سب دشمن
کوئی اپنا نہیں ہوتا ، غلط فہمی!

حقیقت چھپ نہیں سکتی تماشائی!
فریبی جھوٹ ہے سچا ، غلط فہمی!

میں اپنے آپ کو کیسے تسلی دوں
مرا ہمدم نہیں میرا ، غلط فہمی!

⊛

☆

وحشتِ دل میں صبر خاموشی
گھر کی دیوار، جبر، خاموشی

کون سمجھے گا بے زبانی کو
گفتگو میں ہے نشر خاموشی

خامشی ہم کلام تھی ہم سے
ہم نے بھی کر دی نذر خاموشی

مارے جاتے ہیں بولنے والے
ہے تقاضائے عصر خاموشی

کچھ نہ کہنا بھی فرض ہوتا ہے
بندگی میں ہے قصرِ خاموشی

دھڑکنوں پر سکوت طاری ہے
فی زمانہ ہے قبرِ خاموشی

ضبط ٹوٹے گا ایک دن ہمدمؔ
اب اٹھائے گی حشر خاموشی

☆

چائے کا لطف خاص ہے، بارش کے ساتھ ساتھ
خوشبو بھری مٹھاس ہے، بارش کے ساتھ ساتھ

چھتری بغیر گھومنا اچھا لگا ہمیں
بھیگا ہوا لباس ہے، بارش کے ساتھ ساتھ

کیف و سرور ہے مرے گاؤں کے کھیت میں
کھلتی ہوئی کپاس ہے، بارش کے ساتھ ساتھ

خوشبو کا خاص لمس ہے بے کل وجود میں
یادوں کی سبز گھاس ہے، بارش کے ساتھ ساتھ

موجِ ہوا کا زور ہے کھڑکی کے شور میں
شاید کوئی اداس ہے، بارش کے ساتھ ساتھ

تو ہے، ترا جمال ہے دھڑکن کی میز پر
موسم یہی تو خاص ہے، بارش کے ساتھ ساتھ

احساس کی نمود میں تیرا وجود ہے
تو ہی تو آس پاس ہے، بارش کے ساتھ ساتھ

بھیگے ہوئے خیال میں ارمان گھل گئے
تشنہ لبی ہے، پیاس ہے بارش کے ساتھ ساتھ

تیری نوازشات کے بادل امڈ پڑے
تو ہے، ترا سپاس ہے، بارش کے ساتھ ساتھ

ہمدم مرے شعور کا موسم نہال ہے
موجِ سخن شناس ہے، بارش کے ساتھ ساتھ

☆

فضائے دشت میں کیسا سراب چھایا ہے
فریب زاد نگاہوں میں خواب چھایا ہے

مری سرشت میں لکھا ہے آئینہ ہونا
مگر وجود پہ غینی حجاب چھایا ہے

میں اپنے آپ پہ انگلی اٹھانے والا ہوں
مرے سوال پہ تیرا جواب چھایا ہے

کلی کلی کا تبسم ہے تیرے چہرے پر
سفید رنگ پہ کھلتا گلاب چھایا ہے

میں شام ہوتے ہی آنکھوں میں ڈوب جاؤں گا
مرے بدن پہ ابھی آفتاب چھایا ہے

منافقت کے لبادے میں پھول کاڑھے ہوئے
سیہ دلوں پہ سنہرا نقاب چھایا ہے

پون پون سے چھلکتی ہے ہجر کی بارش
دل و نظر میں ابھی تک سحاب چھایا ہے

یہی ہے شام کے اخبار کی بڑی سرخی
لہو کا کھیل ہے جاری، عذاب چھایا ہے

صدائے موجۂ گل ہے وہ پیار کی آواز
سماعتوں میں اسی کا خطاب چھایا ہے

دھڑک رہی ہے محبت غزل غزل ہمدم
سخن کے ساز پہ دل کا رباب چھایا ہے

٭

☆

رہا نہیں ہے جنوں میں دماغ رستے کا
لگا ہے دشت کے سینے پہ داغ رستے کا

کوئی تو ہے کہ بگولے دکھائی دیتے ہیں
دکھا دیا ہے ہوا نے سراغ رستے کا

ہمیں تو دور سے منزل دکھائی دیتی ہے
جلا دیا ہے کسی نے چراغ رستے کا

ضرورتوں کا گلستاں تلاش کرتے ہوئے
اڑا دیا ہے شکاری نے زاغ رستے کا

میں شاہراہِ محبت کے درمیان میں ہوں
چلا ہے دونوں طرف سبز باغ رستے کا

سمٹ کے کچے گھڑے میں جو آ گیا تھا کبھی
وہی چناب ہوا ہے سراغ رستے کا

میں اپنے آپ سے ہمدم بچھڑنے والا ہوں
کہاں پہ لے کے چلا ہے فراغ رستے کا

☆

سکوتِ دشت میں ٹھہرا سکوں آمیز لگتا ہے
دسمبر سرد لہجے میں جنوں آمیز لگتا ہے

سفر کی ٹھوکریں مجھ کو خرامِ وصل دیتی ہیں
دیارِ ہجر کا پتھر نگوں آمیز لگتا ہے

سموم آمیز لہجے ہیں، بگولے سانپ جیسے ہیں
عجب پر ہول سا ماحول خوں آمیز لگتا ہے

وہی کہسار سے لپٹی ہوئی عرضِ تمنا ہے
جنونِ تیشۂ دل بھی ستوں آمیز لگتا ہے

حریمِ ذات ہوں میں بھی کلیدِ آشنائی سے
مگر اک اور دروازہ دروں آمیز لگتا ہے

کسی صورت مجھے مایوس ہونے ہی نہیں دیتا
یہی ہے خوش نصیبی ! دل شگوں آمیز لگتا ہے

ستارہ شام سے پہلے سنہرا خواب ہے لیکن
سرابِ آگہی ہمدم فسوں آمیز لگتا ہے

☆

یقین اور گمان میں بھی فاصلہ نہیں رہا
وہ تلخیاں تھیں بیچ میں کہ آئینہ نہیں رہا

سفر میں گام گام پر مسافروں کی بھیڑ ہے
وہ ہم سفر نہیں رہے، وہ راستہ نہیں رہا

ٹھہر گئے تھے خواب بھی اذیتوں کی اوٹ میں
لگی رہی ہے آنکھ بھی کہ رتجگا نہیں رہا

بکھر گئے محیط بھی، ردا سی بھی، مماس بھی
شکستگی کے زاویوں میں دائرہ نہیں رہا

کبھی تو ہم نصیب کی لکیر کے اسیر تھے
حنا کے رنگ میں گھلے تو زائچہ نہیں رہا

حسین سے حسین تر حروف ہو گئے مگر
نجانے کیوں زبان میں وہ ذائقہ نہیں رہا

رکھے گا ساتھ جو ہمیں زمیں سے آسمان تک
ہمارے عہد میں کوئی بھی واقعہ نہیں رہا

قدم قدم پہ زلزلے ہیں فکر کی زمین میں
قیامتوں کا دور بھی تو سانحہ نہیں رہا

وہ ہمدمِ خیال جو مسافتوں کی دھول تھا
بس اک سراب رہ گیا ہے نقش پا نہیں رہا

☆

حبس تھا کہ سکون تھا گھر میں
ہائے ! کیسا جنون تھا گھر میں

زلزلانے لگی تھیں دیواریں
کوئی ٹیڑھا ستون تھا گھر میں

وحشتوں کا عروج تھا شاید
جب دسمبر بھی جون تھا گھر میں

کتنی محنت سے گھر بنایا تھا
کتنے خوابوں کا خون تھا گھر میں

پھول کھلتے، چراغ جلتے تھے
کتنا اچھا شگون تھا گھر میں

آنکھ پھیلی ہوئی تھی گلیوں میں
دیدۂ اندرون تھا گھر میں

رات خواہش پزیر تھی ہمدم
خواب پرور جنون تھا گھر میں

☆

خواہش کے آسمان کی جنت سوار ہے
ہر شخص کے دماغ پہ عورت سوار ہے

جی چاہتا ہے ہجر کے صحرا سے بھاگ لوں
رخشِ جنوں پہ آج بھی شدت سوار ہے

ہر پیکرِ خیال ہے آسیب کی طرح
دل پر کوئی سراب کی صورت سوار ہے

بے سر وجود کے لیے دستار چاہیے
ہر بے ہنر کے ذہن پہ شہرت سوار ہے

موجِ گلِ بہار ہے موجِ خزاں کبھی
بے گھر ہوا کے ہاتھ پہ ہجرت سوار ہے

اہلِ ہوس غلام ہیں اپنے وجود کے
جن پر انا کے لمس کی لذت سوار ہے

بوسہ لبِ حیات کا بھولا نہیں کبھی
مجھ پر ترے وجود کی صحبت سوار ہے

ہنگامۂ شعور کے زنداں میں قید ہے
دیکھو امیرِ شہر پہ خلقت سوار ہے

احساس کی زمین پہ مارا گیا ہوں میں
دامن کے داغ داغ پہ تہمت سوار ہے

سر پر کسی خمار کا بازار سج گیا
عہدہ سوار ہے کبھی دولت سوار ہے

ماضی کا زخم زخم ہے فردا بنا ہوا
لیکن ہمارے حال پہ غفلت سوار ہے

شاید کسی مفاد کے دشمن سے جنگ ہے
امن و اماں کے نام پہ دہشت سوار ہے

لو ہم نے قافلے کو سویرا دکھا دیا
لو کاروانِ دل پہ قیادت سوار ہے

ہمدم فضائے جبر ہے اظہار کیا کروں
بس میرے ذہن و دل پہ محبت سوار ہے

✺

☆

میری آنکھیں ، میرے خواب
خوشبو ، تتلی اور گلاب

میری تنہائی کے ساتھی
کاغذ ، پنسل اور کتاب

اجڑے ہوئے گلشن کا فسانہ
ٹوٹی ٹہنی اور گلاب

پیاس کا دریا صحرا جیسا
دشتِ جنوں کی دھوپ سراب

سارا سودا نیت کا ہے
دل کا لگنا کارِ ثواب

خواب دھنک کے رنگوں جیسے
پس منظر بے رنگ سحاب

ہم تو ہیں بس میں اور تو!
چھوڑو جی یہ آپ! جناب!

ڈوب کے منزل پا جاتا ہے
کچے گھڑے کا عشق چناب

دل کی باتیں جھوٹی باتیں
چاہت خیر علیحدہ باب

عشق کے اپنے ہی کلیے ہیں
مثبت، منفی، ضرب حساب

اپنے آپ سے کیا کیا پوچھا؟
خاموشی بس ایک جواب

آئینے سے جھانک رہا ہے
آدھا چہرہ اور نقاب

ہجر کا رستہ کاٹ رہا ہے
ہم دونوں کے بیچ حجاب

آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں
جھیل کا پانی اور حباب

ایک غریب کا عیش ہی کیا ہے
سادہ روٹی اور کباب

مر جانا ہے مشکل ہمدم
لیکن جینا اور عذاب

✺

☆

فریبِ چشمِ تمنا حسین تھوڑی ہے
یہ آئنے کا جہاں ہے زمین تھوڑی ہے

دیارِ عشق جہاں ہے زمین تھوڑی ہے
جو عین قاف کے دائیں ہے شین تھوڑی ہے

جہاں بھی خون برستا ہے خوش نہیں رہتا
یہ جیتا جاگتا دل ہے مشین تھوڑی ہے

یہ آئنے کی مسافت ہے طے نہیں ہوتی
یہ خواب خواب سا منظر یقین تھوڑی ہے

ہم اپنے آپ سے دوری کہاں سمجھتے ہیں؟
سرائے ذات یہیں پر ہے، چین تھوڑی ہے

ہم آپ اپنی شریعت کے مقتدی ٹھہرے
ہمارے عشق کا مسلک ہے، دین تھوڑی ہے

ترے خیال سے قائم ہیں دھڑکنیں میری
مکان دل ہے مگر تو مکین تھوڑی ہے

ہر ایک پھول کی صورت دکھائے پھرتی ہے
صدائے گل ہے کسی کی امین تھوڑی ہے

محبتوں کا مسافر کبھی بدلتا نہیں
مریدِ دل ہے وفا میں ذہین تھوڑی ہے

کچھ اور لوگ ہیں شیطان کے نمائندے
منافقت میں فقط وہ لعین تھوڑی ہے

ہر ایک تیر کا رخ ہے مری ہی جانب کیوں؟
یہ میرا گھر ہے عدو کی کمین تھوڑی ہے

اک اور ہجر پڑا ہے وصال سے آگے
یہ دل فریب نشہ ہم نشین تھوڑی ہے

جنون عشق کبھی سیر تو نہیں ہوتا
ہے ذوق وشوق مگر بہترین تھوڑی ہے

ترے مقام سے لپٹا ہے معتبر ہو کر
ترے لیے یہ ترا کم ترین تھوڑی ہے

ترے وجود نے بخشی ہے چاندنی ہمدؔم
یہ آفتاب کا سایہ حسین تھوڑی ہے

☆

ہوا کا ساتھ نبھانے میں عمر گزری ہے
دیا جلانے، بجھانے میں عمر گزری ہے

کوئی چراغ ضروری تھا روشنی کے لیے
سو اپنا آپ جلانے میں عمر گزری ہے

غبارِ چشم دریدہ سے کیسے نکلوں گا
مری تو آئینہ خانے میں عمر گزری ہے

حقیقتوں کی کہانی کوئی نہیں سنتا
اسی لیے تو فسانے میں عمر گزری ہے

ہوا کے دوش پہ اڑتا ہوا پرندہ ہوں
قفس بھی ساتھ اڑانے میں عمر گزری ہے

ہمارے بیچ فقط آئینے کا پردہ ہے
ہمیں بھی ملنے ملانے میں عمر گزری ہوئی ہے

میں اپنے آپ سے روٹھا ہوں بارہا لیکن
کسی کو اپنا بنانے میں عمر گزری ہے

جدید شخص ہوں لیکن عجب روایت ہے
پرانی رسم نبھانے میں عمر گزری ہے

کسی کا بوجھ اٹھایا کسی کو منزل دی
گرے ہوؤں کو اٹھانے میں عمر گزری ہے

میں ہجرتیں بھی مکمل نہ کرسکا شاید
کہ بے گھری کے ٹھکانے میں عمر گزری ہے

قدم قدم پہ بھٹکتا ہے قافلہ میرا
سو رہبروں کو جگانے میں عمر گزری ہے

جو بے خودی میں گزاری خبر نہیں ہمدم
خود آگہی کے زمانے میں عمر گزری ہے

☆

صدائے موجِ محبت کی پیاس باقی ہے
سماعتوں میں ابھی تک مٹھاس باقی ہے

میں زرد زرد خزاؤں کے ساتھ زندہ ہوں
خدا کا شکر! بدن پر لباس باقی ہے

سراب دور کرے گا یہ آس کا پانی
ابھی تو میز پہ آدھا گلاس باقی ہے

مجھے ملی ہے وراثت مرے بزرگوں کی
مری رگوں میں لہو کی اساس باقی ہے

کئی دنوں سے پرندے ادھر نہیں آئے
ہمارے گھر کی فصیلوں پہ گھاس باقی ہے

مرے گمان کی منزل یہیں کہیں ہے مگر
مرے یقین سے آگے قیاس باقی ہے

وہ جس کے نام پہ چلتی ہیں دھڑکنیں دل کی
کہیں تو کوئی طبیعت شناس باقی ہے

عجیب خوف پلا ہے خدا کی بستی میں
دھواں دھواں ہیں فضائیں ہراس باقی ہے

چھپے ہوئے ہیں دریدہ بدن محبت میں
وفا کے کھیت میں ہمدؔم کپاس باقی ہے

✷

☆

کس جرم، کس شمار میں مارا گیا مجھے
ہائے! یہ کس دیار میں مارا گیا مجھے

میں روشنی کے باب کا پہلا سفیر تھا
کیسے سیاہ زار میں مارا گیا مجھے

قاتل بھی جانتا نہیں کیا میرا جرم تھا
کب اپنے اختیار میں مارا گیا مجھے

کرب و بلا بپا کیے وحشت کی جنگ میں
میدانِ کارزار میں مارا گیا مجھے

اپنوں کے اعتبار میں کھویا ہوا تھا میں
کیوں کر عدو کے وار میں مارا گیا مجھے

ہر زاویہ یقین کے محور سے چھین کر
بے دائرہ مدار میں مارا گیا مجھے

میں تھا دیارِ موجۂ گل میں بسا ہوا
بارود کے غبار میں مارا گیا مجھے

جنت کی سرزمین کو دوزخ بنا دیا
کس عیش، کس خمار میں مارا گیا مجھے

میں شیر دل جوان تھا گیدڑ کے شہر میں
چھپ کر کہیں کچھار میں مارا گیا مجھے

بچ کر سرائے خواب سے باہر نہ جا سکوں
اک بحرِ بے کنار میں مارا گیا مجھے

میرے وطن کی خاک سے کچھ بھی وفا نہ کی
میرے لہو کی دھار میں مارا گیا مجھے

دیکھا ہے قتل گاہ کو ٹی وی پہ بار بار
ہر بار اشتہار میں مارا گیا مجھے

میرا پیام امن تھا، پھر بھی نجانے کیوں؟
سوچوں کے انتشار میں مارا گیا مجھے

گولی عدو کے نام کی دل پر مجھے لگی
کچھ ایسے اختصار سے مارا گیا مجھے

کوزہ گروں کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا
مٹی کے شاہکار میں مارا گیا مجھے

میرے لہو کا راستہ سچی لکیر ہے
لمبی سی ریل کار میں مارا گیا مجھے

مجھ پر کسی ثواب کا الزام تک نہ ہو
شہرِ گناہ گار میں مارا گیا مجھے

پھولوں پہ جان وار کے میں سرخ رو ہوا
ہمدم بھری بہار میں مارا گیا مجھے

☆

پیشِ نظر سراب سے پردے ہٹا دیے
موجِ بلا نے ریت کے پیکر مٹا دیے

مٹی پہ لال رنگ میں چوہوں نے دوڑ کر
بلی کے ڈر سے خوف کے پاؤں بنا دیے

جن کو مرے شعور نے دیکھا نہ تھا کبھی
زنگارِ آئینہ نے وہ چہرے دکھا دیے

پہلے تو اپنے خون سے مٹی کشید کی
پرکھوں نے پھر زمین پہ گاؤں بنا دیے

جگنو مثال شخص تھا رستے میں کیا ملا
خواہش کی سرزمین میں تارے اگا دیے

میں نے تو اپنے آپ سے خوابوں کی بات کی
لوگوں نے میری ذات کے پرزے اڑا دیے

میں تو کسی بھی حال میں شکوہ نہ کر سکا
تو نے جو زخم بھی دیے نامِ وفا دیے

میں تو حدودِ ذات میں اپنا اسیر تھا
اہلِ قفس نے سوچ پہ پہرے بٹھا دیے

اِس بار تو ہوا بھی بہت سازگار تھی
بجھتے ہوئے چراغ بھی ہمدم جلا دیے

✻

☆

سرِ غزل جو بہ قافیہ و ردیف تر ہے
محبتوں کی زمین ساری لطیف تر ہے

کئی فسانے ہیں بارگاہِ نگہ سے آگے
بجز حقیقت یہ آئینہ بھی کثیف تر ہے

تجھے سمجھتا ہے حسن کی کائنات ہے تو
مرا تخیل جو شاعری میں نحیف تر ہے

عجب روایت ہے کج کلاہی میں سربلندی
رذیل ٹھہرا یہاں پہ جو بھی شریف تر ہے

یہاں پہ صدیوں سے معتبر ہے جدید ہونا
ازل سے رسمِ کہن جہاں میں ضعیف تر ہے

اداس موسم کی ہر گھڑی کو سنوارتی ہے
یہ فصلِ گل جو خزاں رتوں میں خریف تر ہے

مرے جنوں کو ابھارتا ہے محبتوں میں
مرا عدو جو رقابتوں میں حریف تر ہے

وہ شیر دل ہے جو مسکرائے گا مشکلوں پر
وہی گزارے گا زندگی جو ظریف تر ہے

حسین لہجے میں کون ہمدم غزل سرا ہے
سماعتوں میں لطیف خوشبو خفیف تر ہے

✲

☆

دل لگی میں ہوئی محبت ہے
یا مری آخری محبت ہے

میں محبت میں مر چکا کب کا؟
تو مری دوسری محبت ہے

بے سبب تو نہیں ہے پاگل پن
بے خودی ، بے کلی محبت ہے

آگہی ، فکر ، بندگی اچھے
اور سب سے بڑی محبت ہے

پھول جیسی ہے زندگی میری
موجۂ گل تری محبت ہے

ساتھ تیرا ہے ایک دو پل کا
اور مجھے دائمی محبت ہے

تو زمانہ گزار ہے لیکن
میری گھٹی پڑی محبت ہے

جان دیتا ہوں میں محبت پر
بس یہی تو مری محبت ہے

سانس لیتا نہیں یونہی ہمدم
ہاں مری زندگی محبت ہے

☆

دھوپ نگری میں عینک لگا کر چلے
کون آنکھوں پہ کالک لگا کر چلے

یوں بھی اہلِ گلستاں نے دھوکہ دیا
سبز لکڑی کو دیمک لگا کر چلے

ہم سے قائم رہی ان کی سودا گری
ہم بھی گاہک پہ گاہک لگا کر چلے

بے نمو دور کے بے نمو لوگ تھے
بانجھ مٹی میں پالک لگا کر چلے

راستہ کاٹنا تھا ضروری جنہیں
وہ ترقی پہ پھاٹک لگا کر چلے

وہ تو سرکس کے گمنام کردار تھے
جو سرِ راہ ناٹک لگا کر چلے

آئینہ تو انہیں بھول سکتا نہیں
آئینے پر جو چیچک لگا کر چلے

آٹھواں سر محبت کا جلتا رہا
ہم چراغوں میں دیپک لگا کر چلے

ہم نے لڈو پہ کھیلی ہیں یوں بازیاں
چائے کی ایک چینک لگا کر چلے

گاؤں سے شہر تک ہم جہاں بھی گئے
اپنے حصے کی بیٹھک لگا کر چلے

ہم نہ غالب نہ آتش تھے ہمدم مگر
کتنے لوگوں سے چشمک لگا کر چلے

☆

دور سے آتے ہی آواز کھڑاؤں کی
جاگی ہے زنجیر ہمارے پاؤں کی

مٹی کی آواز پڑی ہے کانوں میں
شاید آگے کچی سڑک ہے گاؤں کی

شام سے پہلے سارے بچے گھر پہنچیں
اِک جیسی امید ہے ساری ماؤں کی

پنچایت ہو، کشتی ہو یا میلہ ہو
اونچی ہو دستار ہمارے گاؤں کی

اِک آنگن میں اک دروازہ سجتا ہے
کب ٹوٹے گی یہ دیوار اناؤں کی

پھل تو آدھے آدھے بٹ ہی جاتے ہیں
کون کرے تقسیم ہماری چھاؤں کی

تھوڑی دیر جلا ہوں پھر دھندلایا ہوں
میں نے بھی رکھی ہے لاج ہواؤں کی

پرکھوں نے یہ مندر دیس بنایا تھا
بستی ہے یہ پتھر زاد خداؤں کی

میری کیا اوقات کہ اونچی بات کروں
مجھ پر برسی بارش خاص دعاؤں کی

موسم نے کچھ اور بھی پاگل کر ڈالا
موجِ گل سے مہکی لہر ہواؤں کی

جھوٹی دنیا سے ہمدم کیا لینا ہے
بات کروں گا میں تو دور خلاؤں کی

☆

تھوڑی سی زندگی میں محبت شدید کی
گویا ترے وجود سے دھڑکن کشید کی

پہلے تو ایک پل میں بہارِ وصال کو
پھر جو گھڑی بچی ہے وہ ہجراں گزید کی

مجھ پر حسب نسب کی شرافت کا رنگ تھا
دیکھا مجھے تو شہر کے لوگوں نے دید کی

اٹھا کوئی نہ ہاتھ بھی بیعت کے واسطے
مٹی پلید ہو گئی دستِ یزید کی

تعبیر کے یقین پہ سونا پڑا ہمیں
ہم نے بھی خواب خواب کو خواہش رسید کی

یہ تو گلِ مراد کے کھلنے کا وقت تھا
مالی نے کیوں بہار میں ٹہنی برید کی

سوزِ جنونِ عشق قلندر کا رقص تھا
سانسوں میں گونجتی ہے رباعی فرید کی

پھر دو دلوں نے عشق میں جینے کی ٹھان کر
کی تازہ داستان یہ ماضی بعید کی

دامن کا چاک عشق کے دم سے رفو کیا
مرشد نے بات مان لی اپنے مرید کی

ہنگامۂ شعور میں اپنا بھی نام ہے
ہم نے بھی اس جہان میں انگلی شہید کی

اسمِ مراد پا گیا، جنت میں آ گیا
شہرِ وفا میں جس نے محبت کلید کی

تو نے بغیر مول کے اپنا بنا لیا
دینا پڑے گی داد بھی حسنِ خرید کی

صبحِ جمالِ نور کو زیبِ سخن کیا
موجِ غزل میں کیٹس کی بیوٹی ارید کی

احساس کی زمین پہ لفظوں کے پھول ہیں
اُردُو زبان دیکھیے دورِ جدید کی

اِک اور عشق کیا کریں ہمدؔم فقیر نے
جو بھی پھرا ہے اس پہ جہنم وعید کی

مر کر بھی اعتبار کے قابل رہیں گے ہم
راہ وفا میں زندگی ہمدؔم شہید کی

☆

خواب آنکھوں میں بھر کے دیکھا ہے
تجھ کو تعبیر کر کے دیکھا ہے

جب تجھے آنکھ بھر کے دیکھا ہے
زندگی کو ٹھہر کے دیکھا ہے

زندگی کا کوئی مقام نہیں
ہر گلی سے گزر کے دیکھا ہے

پھول خوشبو جدا نہیں کرتے
میں نے اکثر بکھر کے دیکھا ہے

دشت ہے یا کوئی سمندر ہے
کس نے دل میں اتر کے دیکھا ہے

اِک جہاں سے گزر کے زندہ ہوں
یہ جہاں بھی تو مر کے دیکھا ہے

یہ محبت تو مار دیتی ہے
میں نے بھی پیار کر کے دیکھا ہے

اڑ رہا ہے مری طرح پھر بھی
ایک پر کو کتر کے دیکھا ہے

زندگی بھر یہی عبادت کی
عشق لازم تھا، کر کے دیکھا ہے

اِک ستارہ اتر رہا تھا کہیں
بام پر جو سحر کے دیکھا ہے

اِتنی پہچان ہو گئی ہمدم
آئینہ بھی سنور کے دیکھا ہے

☆

کافی میں گھلی تصویر تری
لہجے میں رہی تاثیر تری

میں تجھ کو سوچا لاکھ سجن!
دیوار بنی تصویر تری

آنکھوں میں جھل مل خواب ترے
ہے صبح مری، تعبیر تری

اِک پھول سجا ہے کالر میں
محسوس ہوئی توقیر تری

لو دل کا فسانہ الٹ دیا
رانجھے کو بنایا ہیر تری

میں کچھ بھی نہیں ہوں اپنے لیے
ہاں ذات مری، جاگیر تری

ہے سات سروں کا دریا تو
ہر موج میں ہے تاثیر تری

منہ زور ہے رشتہ چاہت کا
کیا کام کرے تدبیر تری

ہے جانِ ہمدم، جانِ غزل
دھڑکن دھڑکن تحریر تری

✵

☆

زندگی تو کسی صورت نہیں کھلنے والی
اِک محبت میں یہ عورت نہیں کھلنے والی

چاک دامن ہیں گریباں کا بھرم رکھتے ہیں
تنگ کپڑوں پہ طبیعت نہیں کھلنے والی

اِک زمانہ مرے کردار سے ناواقف ہے
یار لوگوں پہ حقیقت نہیں کھلنے والی

ایک دیوان مجھے چاہیے کچھ کہنے کو
چند شعروں میں محبت نہیں کھلنے والی

بات کرنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں
عام لہجے سے سماعت نہیں کھلنے والی

میر خوانی بھی کوئی میر ہی کر سکتا ہے
ایسی جدت پہ روایت نہیں کھلنے والی

ناز و انداز محبت کا پتہ دیتے ہیں
دھول دھپے سے شرارت نہیں کھلنے والی

اپنی دستار کے شملے کو اٹھائے رکھنا
سر جھکانے سے شرافت نہیں کھلنے والی

طاق در طاق چراغوں کو جلانا ہو گا
اِک ستارے سے یہ ظلمت نہیں کھلنے والی

اب اسی زلف گرہ گیر کی الجھن میں ہوں
میں سمجھتا تھا قیامت نہیں کھلنے والی

اپنے اعمال سے دوزخ کو بجھاتے آنا
ایسے کردار پہ جنت نہیں کھلنے والی

خون قرطاس پہ اگلے گا حقیقت ہمدم
جھوٹے لفظوں سے صداقت نہیں کھلنے والی

☆

خودی نہیں ہے، انا کی تلاش جاری ہے
بجھے دیے سے ہوا کی تلاش جاری ہے

عجیب عہد ہے، مرتا نہیں کسی پہ کوئی
گئے دنوں میں وفا کی تلاش جاری ہے

پری جمال رتوں کا سفیر کوئی نہیں
ہر ایک رخ پہ حیا کی تلاش جاری ہے

کوئی تو ہاتھ اٹھائے گا آدمی کے لیے
ہمارے حق میں دعا کی تلاش جاری ہے

ہم ایسے خاک نشینوں نے اوڑھ رکھی ہے
فلک پہ جیسی گھٹا کی تلاش جاری ہے

کہیں پہ چاک گریباں ہیں عام پھرتے ہوئے
کہیں پہ بندِ قبا کی تلاش جاری ہے

کلی کہیں کوئی کھلتی نظر نہیں آتی
کئی دنوں سے صبا کی تلاش جاری ہے

سنا ہے کوئی کسی پر یقیں نہیں کرتا
سنا ہے جھوٹ نما کی تلاش جاری ہے

پڑا ہے وقت کا دریا ہمارے رستے میں
کنارِ آب عصا کی تلاش جاری ہے

کسی کے جرم پہ کرتا نہیں گرفت کوئی
سلے لبوں پہ سزا کی تلاش جاری ہے

بدل رہا ہے زمانے میں حبس کا موسم
خلا میں تازہ فضا کی تلاش جاری ہے

کئی دلوں پہ محبت نے دستکیں دی ہیں
کئی دلوں میں صدا کی تلاش جاری ہے

کسی کو ہوش نہیں ہے کہ دل میں جھانک سکے
یہ کس جہاں میں خدا کی تلاش جاری ہے

قدم قدم پہ مریضوں کی بھیڑ ہے ہمدم
مرض ہے دل کا، دوا کی تلاش جاری ہے

☆

کہیں پہ نقش، کہیں پر لکیر کھینچے گا
جنوں خرد کی زمیں پر لکیر کھینچے گا

رہا جو سجدہ ءِ دل میں تو دیکھنا اک دن
تمام دشت جبیں پر لکیر کھینچے گا

وہ ایک اسم جو دل میں نمو پذیر ہوا
ہر اک عقیدہ و دیں پر لکیر کھینچے گا

میں اپنے ہونے نہ ہونے پہ غور کیسے کروں
یہی گماں یقیں پر لکیر کھینچے گا

نکل کے اپنی روایت سے ایک مصرعۂ تر
غزل کی تازہ زمیں پر لکیر کھینچے گا

صریرِ قلب ملائے گا زندگی کے ساتھ
قلم جو حرف نشیں پر لکیر کھینچے گا

نکل رہا ہے مرا خون کس طرف دیکھو
یہ تیر کس کی کمیں پر لکیر کھینچے گا

وہ ہجر زاد سمیٹے گا وصل کی خوشیاں
دیارِ قرب و قریں پر لکیر کھینچے گا

خیال و خواب میں ڈھلتا ہوا حسیں پیکر
جہاں ملے گا وہیں پر لکیر کھینچے گا

یہ کس نے اسمِ محبت کی آگہی بخشی
یہ کون دل کے مکیں پر لکیر کھینچے گا

وہ جس کی خشک زمیں پر خطوط کھینچے گئے
عجب ہے ماہِ جبیں پر لکیر کھینچے گا

کیے ہوئے ہیں مرے دل پہ دستخط اس نے
جو عین عشق کے شیں پر لکیر کھینچے گا

میں ایسے ہاتھ کی بیعت کبھی نہیں کروں گا
جو میری ایک نہیں پر لکیر کھینچے گا

یہی مقام ہے جس پر وجود ملتے ہیں
ہمارا عشق یہیں پر لکیر کھینچے گا

جہاں پہ چاک گریباں خرام کرتے رہے
مرا شعور وہیں پر لکیر کھینچے گا

کرن کرن جو اترتا ہے نیند میں ہمدم
وہ چاند خواب گزیں پر لکیر کھینچے گا

☆

یہ رنگ ، یہ جمال ہے دیکھا ہوا کہیں
آئینۂ خیال ہے دیکھا ہوا کہیں

کیسے کہوں کہ آپ سا دیکھا نہیں کوئی
یہ حسن بے مثال ہے دیکھا ہوا کہیں

مخمور کر رہا ہے جو سانسوں کی ڈوریاں
یہ ریشمی رومال ہے دیکھا ہوا کہیں

دل پر کسی سرور کے رنگوں کا لمس ہے
دھڑکن میں یہ کمال ہے دیکھا ہوا کہیں

اتری ہے جل پری کوئی آنکھوں کی جھیل میں
خوابوں کا کوئی جال ہے دیکھا ہوا کہیں

پیشِ نظر وجود ہے پھر نارسا کوئی
چہرے پہ اک ملال ہے دیکھا ہوا کہیں

میں بے خرد نہیں ہوں پہ کیسا جنون ہے؟
شاید کوئی ابال ہے دیکھا ہوا کہیں

یوں ہی کسی کو دیکھ کے کہنا پڑا مجھے
ماضی کا کوئی حال ہے دیکھا ہوا کہیں

رقاصۂ خیال ترا انگ تو نہیں
دھمال میں جلال ہے دیکھا ہوا کہیں

یوں ہی نہیں ترنگ میں ہمدمؔ پون پون
آنکھوں میں کوئی سال ہے دیکھا ہوا کہیں

.

☆

الف آغاز کرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے
بشر کا روپ بھرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

پسِ پردہ کہانی میں کئی کردار ہوتے ہیں
تماشا عام کرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

ٹھکانہ یوں نہیں بدلا پرندوں نے بہاروں میں
ثمر آنے، نکھرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

جبینِ برگ پر لکھی ہوئی تحریر کہتی ہے
چمن کو یوں سنورنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

حوالہ دے نہیں سکتے سخن آمیز لمحوں کا
خموشی سے گزرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

درونِ آئینہ ٹھہرا ہوا گہرا سمندر تھا
ڈبونے اور ابھرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

ذخیرہ کم نہیں ہوتا نجومِ ظلمتِ شب کا
ردائے شب اترنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

''ژ'' پر حرف ریزی کی ملی تھی اک گھڑی لیکن
زمیں تخلیق کرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

ژولیدہ سوچ کا محور کوئی الھڑ جوانی تھی
سلجھنے اور سدھرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

شگوفے سے شرارے تک کٹھن تھا یوں سفر کرنا
صریرِ گل بکھرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

ضمیرِ زندگی بن کر رگِ جاں میں جو رہتا ہے
طلسم آمیز جھرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

ظہورِ آدمِ خاکی سراسر بندگی پر تھا
عبادت سے مکرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

غبارِ وادیٔ سینا میں گم ہے آج بھی دنیا
فصیلِ دل پہ مرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

قفس آباد رکھا ہے ازل سے کچھ پرندوں نے
کٹیلے پر کترنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

گماں ہے موجۂ الفت کنارے پر کھڑی ہوگی
لبِ دریا بپھرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

محبت کرنے والوں کو کوئی بھی غم نہیں رہتا
نہیں، لیکن، نہ ڈرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

وفورِ شوق میں ڈوبی ہوئی ہیں دھڑکنیں ایسی
ہجومِ غم ٹھہرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

ہوس رکنے نہیں دیتی زمانے میں کہیں ہمدم
یہاں پر پاؤں دھرنے میں زمانے لگ گئے ہوں گے

شاعر کی مزید کتب

طرحی غزلیات
(زیرِ طبع)

https://archive.org/details/@nzkiani
nzkiani@gmail.com